18

ڈاڑھی منڈانے والے احمدی شکست خوردہ ذہنیت رکھتے ہیں انہیں جماعت کے کسی عہدہ کے لئے منتخب نہ کیا جائے

(فرمودہ 19 جون 1942ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"مَیں نے پہلے بھی جماعت کے دوستوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہماری جماعت کوئی انجمن یا اسی قسم کا اَور کوئی نظام نہیں ہے بلکہ ایک مذہبی نظام ہے جو اپنے ساتھ ایک شریعت رکھتا ہے۔ قرآن کریم کی شریعت جو قیامت تک جاری رہنے والی ہے۔ پس ہماری جماعت کے افراد کو اپنے کاموں میں اور اپنی گفتگوؤں میں اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ دنیا میں اسلامی شریعت کا قیام اور اس کا احیاء ہو۔ مُنہ سے احمدی احمدی کہہ دینے سے کچھ نہیں بنتا جب تک کہ ہم اپنے معاملات اور اپنے تعلقات اور اپنی ہیئت اور اپنی شکل کو احمدیت اور اسلام کے مطابق نہ بنائیں۔

اس وقت اسلام پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور مغربیت اسلام کے رہے سہے نشانوں کو بھی مٹا دینا چاہتی ہے۔ کہیں مغربی فلسفی اسلام کے اُس والہانہ تعلق کو جو وہ بندے اور خدا کے درمیان پیدا کرتا ہے تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کہیں مذہبی تمدن اور اسلامی شریعت کو ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بتا رہا ہے اور کہیں مغربی دستور العمل اور طریقہ اور فیشن

اسلام کے بتائے ہوئے طریقوں کی محبت دلوں سے مٹا رہا ہے۔ پس ہر وہ شخص جو اس فلسفے سے متاثر ہوتا ہے وہ اتنا ہی اسلام کو چھوڑ دیتا ہے، ہر وہ شخص جو اس مغربی تمدن سے متاثر ہوتا ہے وہ اسی قدر اسلام سے دور ہو جاتا ہے اور ہر وہ شخص جو اس فیشن کو اختیار کرتا ہے جسے مغرب نے پیش کیا وہ اتنا ہی اپنے آپ کو اسلام سے نکال دیتا ہے اور اپنے عمل سے اسلام اور احمدیت کو کمزور کرنے کا موجب بنتا ہے۔ کئی لوگ قسم قسم کے حیلے اور بہانے تراش کر یورپ کے فلسفے، یورپ کے تمدن یا یورپ کے فیشن کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اپنے ان اعمال کے لئے دنیا کے سامنے بہانے پیش کرتے ہیں مگر ان بہانوں سے اسلام کی تقویت کسی صورت نہیں ہو سکتی اور نہ ان بہانوں سے ان کی بریت ثابت ہو سکتی ہے۔ بہر حال ان کے اعمال کے نتیجہ میں اسلام اتنی ہی شکست کھا کر پیچھے ہٹتا ہے اور اتنا ہی دشمن اسلام پر حملہ کرنے کے لئے دلیر ہوتا ہے جتنا وہ اس کے اثر سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب ایک یورپین ایک مسلمان کو اپنے فیشن کے لحاظ سے یا اپنے تمدن کے لحاظ سے یا اپنے فلسفہ کے لحاظ سے یا اپنی سائنس کے لحاظ سے اس کے مقام سے ہٹا دیتا ہے تو اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اسلام شکست کھا رہا ہے اور وہ زیادہ جرأت اور زیادہ دلیری سے اسلام پر حملہ کرتا ہے اور اس کی اس جرأت اور دلیری کا ذمہ دار وہ مسلمان ہوتا ہے جس نے اس کی نقل کی۔ پس اس کے نتیجہ میں اسلام کو جتنی شکست ہوتی ہے اس کا ذمہ دار وہی مسلمان ہوتا ہے اور وہ مسلمان کہلانے والا، اپنے اسلام پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہنے والا اور اپنے آپ کو غلط طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی طرف منسوب کرنے والا در حقیقت موذی، مجرم اور مفسد ہوتا ہے۔

مَیں جب ولایت گیا تو ہمارے ایک مبلّغ نے اپنے دل کی کمزوری کی وجہ سے جاتے ہی مجھے اس بات کی رغبت دلانی شروع کر دی کہ ہیٹ تو نہیں مگر کوٹ پتلون یہاں ضرور پہننا چاہئے ورنہ لوگوں پر بُرا اثر پڑے گا اور احمدیت کی تبلیغ کو نقصان پہنچے گا۔ مَیں یہاں سے جاتی دفعہ اپنے لئے گرم پاجامے بنوا کر لے گیا تھا اور گرم پاجامے ہمارے ملک میں عام طور پر پتلون کے مشابہ ہوتے ہیں کیونکہ اگر زیادہ کپڑا لگایا جائے تو پاجامہ بوجھل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر ہمارے ملک میں لوگ لٹھے کی شلوار پہنتے ہیں گو بعض علاقوں میں تنگ پاجامے کا بھی رواج ہے

مگر بہر حال شلوار پہننے والے اور تنگ پاجامہ پہننے والے دونوں ہی جب گرم پاجامے بنواتے ہیں تو وہ تنگ ہوتے ہیں اور اپنی شکل میں پتلون کے مشابہ ہوتے ہیں۔ وہاں چونکہ سردی شدید ہوتی ہے اور وہاں کی سردی کی شدت کی وجہ سے مَیں یہاں سے گرم پاجامے بنوا کر لے گیا تھا مگر جب ہمارے اس مبلّغ نے مجھے یہ مشورہ دیا تو مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ وہی ابلیس جس نے پہلے حوّا کو بہکا کر آدم کو پھسلانے کی کوشش کی تھی اسی ابلیس نے ہمارے اس مبلّغ کو بہکایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اب مجھے بھی بہکانے کی کوشش کرے چنانچہ مَیں نے اسی وقت نیت کر لی کہ اب مَیں گرم پاجامہ بھی یہاں نہیں پہنوں گا گو گرم پاجامے حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی پہن لیا کرتے تھے اور اس ملک میں گرم پاجامہ پہننے کے یہ معنی ہرگز نہیں تھے کہ انگریزی تمدن سے ڈر کر یا انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے مَیں نے ایسا پاجامہ پہنا ہے اور گو میرا یہ فعل سردی کی وجہ سے ہوتا نہ کہ مغربیت کا اثر قبول کرنے کی وجہ سے مگر چونکہ لوگوں کے دلوں میں اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ مغربی تمدن سے تھوڑی سی صلح کر لی گئی ہے اس لئے جتنا جتنا وہ مبلّغ اس بات پر زور دیتے کہ خدا کے لئے شلوار چھوڑ دیں لوگ ہنستے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ گویا آپ ننگے پھر رہے ہیں اتنا ہی میرا دل اس بات پر اَور زیادہ مضبوط ہو جاتا کہ مَیں اس ملک میں اب شلوار پہننا نہیں چھوڑوں گا خواہ یہاں کے رہنے والے یہی سمجھیں کہ ہم ننگے پھر رہے ہیں۔ انگریزوں میں دستور ہے کہ کُرتا پاجامہ ان کے نزدیک رات کا لباس ہوتا ہے اور یہ ان کے دلوں پر اتنا حاوی ہے کہ ہمارے ایک مبلّغ نے جو امریکہ میں بھی رہ چکے ہیں مجھے سنایا کہ ایک دن آٹھ نو بجے کے قریب وہ اپنے کمرہ میں بیٹھے تھے کہ دو عورتیں آئیں اور انہوں نے دروازہ پر دستک دی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے متعلق بعض مسائل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارے وہ مبلّغ اس وقت ہندوستانی لباس میں تھے مگر ان عورتوں کے جوش اور اخلاص کو دیکھ کر وہ نہایت شوق سے نیچے اترے اور انہوں نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے شکار بھیجا ہے مگر جونہی عورتوں نے ان کو دیکھا وہ چیخیں مارتی ہوئی گلی میں بھاگ گئیں اور شور مچانے لگ گئیں کہ ایک پاگل ننگا نکل آیا ہے۔ اس شور پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ہمارے اس مبلّغ نے بتایا کہ مَیں تو انہیں تبلیغ کرنے کے لئے آیا تھا مگر یہ

دیکھتے ہی بھاگ گئیں۔ آخر ایک لمبی گفتگو کے بعد یہ راز کھلا کہ دراصل ہندوستانی لباس پہننے کی وجہ سے انہیں ننگا قرار دیا گیا ہے۔ مگر مَیں ولایت میں اسی لباس میں رہا۔ ایک دن کچھ معززین مجھ سے ملنے کے لئے آئے جن میں سے ایک سرڈینی سن راس تھے جو اورنٹیل کالج لنڈن کے پرنسپل تھے۔ اب وہ فوت ہو چکے ہیں۔ ہمارے سلسلہ سے ان کے نہایت اچھے تعلقات تھے اور وہ ایشیائی مضامین ے متعلق انگلستان میں اہم اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اَور پروفیسر، علم دوست اصحاب اور ریلیجئس کانفرنس کے سیکرٹری وغیرہ بھی تھے۔ باتوں باتوں میں مَیں نے ان سے لباس کا ذکر شروع کر دیا اور کہا کہ ہمارے ایک مبلغ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ مَیں اپنے لباس کو ترک کر دوں کیونکہ انگریز اسے بُرا سمجھتے ہیں اور مَیں اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ مَیں یہی لباس رکھوں گا۔ آپ ہمارے دوست ہیں، آپ بے تکلفی سے بتائیں کہ آپ کے ملک پر ہمارے لباس کا کیا اثر پڑتا ہے اور لوگ اسے کیسا سمجھتے ہیں۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد انہوں نے کہا کہ ہاں بُرا تو سمجھتے ہیں۔ مَیں نے کہا کیوں؟ کہنے لگے اس لئے کہ یہ لباس ہمارے ملک کا نہیں ہم لوگ جو ہندوستان کو دیکھ آئے ہیں۔ اس لباس پر کسی قسم کا تعجب نہیں کرتے مگر باقی لوگ جنہوں نے ہندوستان کو نہیں دیکھا وہ اس لباس کو ایک عجیب سی چیز سمجھتے ہیں اور ایسے ہی دیکھتے ہیں جیسے کوئی تماشہ ہوتا ہے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ آپ لوگ جب ہمارے ملک میں جاتے ہیں تو ہمیں بھی آپ کا لباس تماشہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا آپ اپنا لباس چھوڑ کر ہمارا لباس پہننے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہم تو نہیں کر سکتے۔ مَیں نے کہا جب آپ ایسا نہیں کر سکتے تو آپ یہ امید کس طرح کر سکتے ہیں کہ ہندوستانی اپنے لباس کو چھوڑ دیں اور وہ یہاں آکر آپ کا لباس اختیار کر لیں۔ کیا اس کی وجہ یہی نہیں کہ آپ چونکہ حاکم ہیں اس لئے آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام یہ نہیں کہ ہم دوسرے ملک میں جا کر لوگوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھیں مگر ان کا فرض ہے کہ وہ ہمارے ملک میں آکر ہمارے جذبات اور احساسات کا خیال رکھیں۔ پھر مَیں نے ان سے کہا جب کوئی شخص ہندوستانی لباس کو ترک کر کے انگریزی لباس اختیار کر لیتا ہے تو کیا آپ کے دل کے اندرونی گوشوں میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ ایک شکست خوردہ اور ذلیل شکار ہے۔ ہنس کر کہنے لگے ہم سمجھتے تو یہی ہیں

کہ وہ ڈر کر ہمارے ماتحت ہو گیا ہے۔ پھر مَیں نے ان سے کہا اس لباس کی تبدیلی میں جو نفسیاتی نکتہ ہے وہ در حقیقت یہی احساس ہے جو آپ لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے کہ یہ ایک شکار ہے جسے ہم نے اپنے خیال کے مطابق بنا لیا ہے اور اب اس میں مقابلہ کی طاقت نہیں رہی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو لوگ دوسروں کے تمدن کو اختیار کر لیتے اور ان کی نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں وہ انہی کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں اور خود ذمہ داری کا احساس ان کے دلوں سے جاتا رہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی لباس میں اگر انگلستان کے لوگوں کے سامنے کوئی شخص جاتا ہے تو وہ انہیں اچھا معلوم نہیں ہوتا مگر یہ صرف انگریزوں پر ہی منحصر نہیں ہمارے ملک میں بھی جب کوئی غیر ملکی کسی اَور لباس میں آتا ہے تو لوگوں کو وہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ انگریز چونکہ ہندوستان میں ایک عرصہ سے ہزاروں کی تعداد میں رہتے ہیں اس لئے ان کا لباس ہندوستانیوں کو بُرا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر چینی چونکہ ہمارے ملک میں کم آتے ہیں اس لئے اگر کوئی چینی آجائے تو عورتیں اور بچے اپنے گھروں سے نکل نکل کر اسے تماشہ کے طور پر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ چینیوں کی اسی طرح چوٹی ہوتی ہے جس طرح عورتوں کی ہوتی ہے اور پھر ان کے پاجامے گھگھروں کی طرح ہوتے ہیں۔ لوگ ان کو دیکھتے اور حیران ہوتے ہیں کہ ایک مرد نے عورت کا لباس کیوں پہن رکھا ہے۔ تو صرف عادت کے نہ ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ کوئی چیز عجیب لگتی ہے حالانکہ وہ عجیب نہیں ہوتی اور قدرتی طور پر انسان چاہتا ہے کہ دوسرا شخص میری نقل کرے حالانکہ اس قسم کی نقل عقل کے بغیر ہوتی ہے اور وہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں دے سکتا کہ دوسرا شخص کیوں پاجامہ نہ پہنے اور پتلون پہنے یا پگڑی چھوڑ دے اور ہیٹ پہننا شروع کر دے۔ اگر کوئی نقل عقل کے مطابق ہو تب تو اسے درست تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن جو نقل عقل کے بغیر ہوتی ہے وہ ضرور انسان کو حقیر بنا دیتی ہے اور گو ظاہری طور پر انسان کتنا ہی معزز ہو کر دوسروں کی سوسائٹی میں رہے مگر وہ اپنے دل میں یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک کمزور دل کا آدمی ہے جس نے ہمارے اثر کو قبول کر لیا ہے اور لوگ دراصل انہیں کا اثر قبول کرتے ہیں جن کے تمدن کو وہ اپنے تمدن سے بہتر سمجھتے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ راشے[1] جو سرحد سے ہمارے ملک میں آتے ہیں لوگ ان کا لباس

اختیار نہیں کرتے یا چینیوں کا لباس کیوں نہیں پہنتے یا جاویوں کے لباس کو اپنا لباس نہیں بنا لیتے یا افریقہ کے لوگوں کے لباس کو اپنے لباس پر کیوں ترجیح نہیں دیتے۔ اسی وجہ سے کہ ان پر ان کے تمدن کا اثر نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہ ان کا لباس یورپین لوگوں سے کسی دلیل کی رو سے ادنیٰ ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ تمدنی لحاظ سے چینیوں یا جاویوں یا افریقی لوگوں کے لباس کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ پس جو لوگ انگریزی لباس کی نقل کرتے ہیں وہ انگریزی لباس کی کسی خوبی کی وجہ سے اس کی نقل نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ انگریز حاکم ہیں اور وہ ہندوستانی بندر کی طرح ان کے نقّال بننا چاہتے ہیں۔ انگریز تو اس بات پر مجبور ہیں کہ وہ خواہ ہندوستان میں رہیں اپنے قومی لباس کو ترک نہ کریں مگر جو ہندوستانی ان کے لباس کی نقل کرتا ہے وہ ضرور نقّال ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں تک ایسے احکام کا تعلق ہے جن میں ہماری شریعت روک نہیں بنتی ہم کہہ سکتے ہیں کہ چلو اگر کسی نے ایسی بات نقل کر لی ہے تو کیا ہوا۔ مثلاً اگر کسی ہندوستانی کو انگریزوں سے مل کر رہنا پڑتا ہے اور وہ اکثر انہی کی سوسائٹی میں رہتا ہے تو وہ اگر انگریزوں کا لباس پہن لیتا ہے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ مجبور ہے اس کا زیادہ تر تعلق چونکہ ہندوستانیوں کی بجائے انگریزوں سے ہے اور انگریزوں کے ہاں اس کا آنا جانا اکثر رہتا ہے۔ اس لئے اگر اس نے انگریزوں کا لباس اختیار کر لیا ہے تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ ہماری شریعت نے اس سے منع نہیں کیا گو بعض لوگ اس قسم کے بھی ہوتے ہیں جن کا انگریزوں سے اس قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور پھر بھی وہ انگریزی لباس پہنے پھرتے ہیں۔ یہیں قریب کے ایک گاؤں کا ایک نیم پاگل لڑکا ہے جو ہمیشہ کوٹ پتلون پہنتا ہے۔ اس کے سارے رشتہ دار دھوتی اور لنگوٹی باندھے پھرتے ہیں مگر اُسے کوٹ پتلون کے بغیر کوئی لباس پسند ہی نہیں آتا۔ مجھے ہمیشہ اسے دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ یہی بندروں والی نقل ہے۔ اگر کسی کو ہمیشہ انگریزوں سے مل کر رہنا پڑتا ہے تو اُن کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھنے کے لئے اگر وہ انگریزی لباس پہن لیتا ہے تو یہ اَور بات ہے مگر دوسرے لوگ جو انگریزی لباس پہننے کے عادی نہیں ان کا انگریزی لباس پہننا محض ایک نقل ہوتی ہے اور وہ دوسرے لباسوں کو اس لئے اختیار نہیں کرتے کہ ان کے دل پر انگریزی لباس کا ہی رعب ہوتا ہے

اور لباسوں کا رعب نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر کسی اَور لباس کی وہ کسی اَور کو نقل کرتے دیکھیں تو شاید وہ خود بھی اس پر ہنسنے لگ جائیں۔

مجھے ہمیشہ ایک لطیفہ یاد رہتا ہے جو مَیں پہلے بھی بعض دوستوں کو سنا چکا ہوں کہ 1918ء میں جب انفلوئنزا کا شدید حملہ ہوا تو مجھ پر بھی اس کا شدت سے حملہ ہوا اور کئی سال تک میری طبیعت کمزور رہی۔ مَیں ایک دفعہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے دریا پر گیا ہوا تھا کہ ایک دوست نے اپنے متعلق ذکر کیا کہ مَیں ریوڑیاں بڑی اچھی بنالیتا ہوں اور مذاق میں بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ ریوڑیاں ان کے گھر کے لوگ اچھی بناتے ہیں یہ تو صرف دیکھنے والے ہیں۔ اس پر کچھ اُن کو غیرت آئی اور کچھ لوگوں نے زور دیا آخر گُڑ اور تِل منگوائے گئے اور انہیں ریوڑیاں بنانے کے لئے کہا گیا پھیرو چیچی میں ان دنوں احمدیہ سکول ہوا کرتا تھا اس کے کمروں میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک کمرہ میں مَیں لیٹا ہوا تھا اور ہمارے دوست عبد الاحد خان صاحب افغان کابلی مجھے دبا رہے تھے کہ ریوڑیاں تیار ہونے میں دیر ہوگئی اور جتنے عرصہ میں ہم سمجھتے تھے کہ ریوڑیاں تیار ہو جائیں گی اس سے کچھ زیادہ وقت ہو گیا اور آخر ہوتے ہوتے ساڑھے نو دس بجے رات کا وقت آ گیا۔ مَیں نے کہا۔ میاں عبد الاحد خان جاؤ اور دیکھو کہ کیا ہوا۔ اتنی دیر کیوں ہو گئی ہے۔ انہوں نے آکر کہا۔ کئی دوست بیٹھے ہوئے ہیں۔ گاؤں کے لوگ بھی موجود ہیں مگر جو گُڑ ہے وہ راب کی طرح پتلا ہو گیا ہے اور کبھی ایک کو چکھایا جاتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔ کوئی کہتا ہے یہ آدمیوں کے کھانے کے قابل نہیں رہا یہ تو گدھوں کے آگے ڈالنے کے قابل ہے اور کوئی کہتا ہے گھوڑوں کے آگے ڈال دو۔ غرض اسی طرح باتیں ہو رہی ہیں یہاں تک تو انہوں نے بڑی سنجیدگی سے باتیں کیں۔ اس کے بعد کہنے لگے اور درد صاحب اور یہ کہہ کر وہ بے اختیار ہو کر ہنس پڑے ان کی عادت نہیں کہ میرے سامنے اس طرح ہنسیں مگر وہ اس وقت بے اختیار ہو کر ہنس پڑے اور جیسے کہتے ہیں ہنستے ہنستے پسلیاں ٹوٹ گئیں یہی کیفیت ان کی تھی وہ ہنستے چلے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہنستے ہنستے گر جائیں گے۔ آخر مَیں نے کہا درد صاحب کو کیا ہوا۔ وہ کہنے لگے۔ درد صاحب اور پھر ہنسنے لگ گئے۔ مَیں حیران ہوا کہ آخر ہوا کیا جو ان کی ہنسی نہیں رکتی۔ مَیں نے کہا میاں عبد الاحد خان

درد صاحب کی کیا بات ہے۔ اس پر وہ کچھ ہنسی کو ضبط کر کے کہنے لگے۔ درد صاحب۔ اور پھر ہنسنے لگ گئے۔ آخر مَیں نے کہا یہ کیا لغو طور پر ہنس رہے ہو سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ ہؤا کیا۔ اس پر انہوں نے بڑی مشکل سے رُک رُک کر اور سینے کو ہاتھ سے دبا دبا کر کہا کہ درد صاحب عورتوں والی پر بیٹھے ہیں۔ مَیں اس پر اَور حیران ہؤا کہ یہ "عورتوں والی" کیا چیز ہے۔ مگر مَیں نے سوچا کہ اب ان سے کچھ پوچھنا فضول ہے خود ہی دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ کمرہ کی کھڑکی کھولی تو مَیں نے دیکھا کہ درد صاحب بڑے آرام سے ایک پیڑھی پر بیٹھے ہیں۔ پٹھانوں میں چونکہ مرد پیڑھی پر نہیں بیٹھتے بلکہ عورتیں بیٹھتی ہیں اس لئے میاں عبد الاحد خان صاحب کے نزدیک درد صاحب کا پیڑھی پر بیٹھنا ایسی ہی حرکت تھی جیسے ہمارے ملک میں کہتے ہیں کہ فلاں کا مُنہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے شہر میں پھرایا گیا۔ ان کے نزدیک درد صاحب جیسا عالم آدمی چونکہ عورتوں والا کام کر رہا تھا اس لئے یہ بات ان کے نزدیک سخت ہنسی کا موجب تھی۔ مگر ہمارے ملک میں عام طور پر مَرد پیڑھی پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

اب دیکھو یہ ایک رواج ہے جو ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے مگر میاں عبد الاحد خان صاحب کو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ خود بھی پیڑھی لے کر بیٹھ جائیں بلکہ اپنے رواج کے مطابق انہوں نے درد صاحب کا پیڑھی پر بیٹھنا ہنسی کا موجب سمجھا۔ تو مختلف ملکوں میں مختلف رواج ہوتے ہیں اور انسان ان سب رواجوں کی نقل نہیں کرتا۔ نقل اسی کی کرتا ہے جس کو اپنے دل میں عظمت دے دیتا ہے اور نقل کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اب اس شخص نے اس قوم کو عظمت دے دی ہے جس کے رواج اور جس کے طریق کو اس نے اختیار کیا ہے مگر جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے جس حد تک سوال ملکی رواج کا ہے اس حد تک ان باتوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں شریعت کے احکام کا سوال آجائے وہاں اگر ہم دوسروں کی نقل کریں گے تو یقیناً ہم اسلام کی ذلت کے سامان پیدا کر کے دشمنوں کی مدد کرنے والے قرار پائیں گے۔ انہی نقلوں میں سے ایک نقل ڈاڑھی منڈوانا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ایک دفعہ نہیں متواتر ڈاڑھی منڈوانے سے منع فرمایا ہے۔[2] اور ڈاڑھی منڈوا کر کوئی خاص فائدہ بھی انسان کو نہیں پہنچتا لیکن باوجود اس کے مَیں دیکھتا ہوں کہ مسلمان کہلانے والے دوسرے لوگوں میں سے تو اکثر شہری ڈاڑھی

منڈواتے ہی ہیں۔ احمدیوں میں سے بھی ایک حصہ ڈاڑھی منڈواتا ہے اور باوجود بار بار سمجھانے کے وہ اپنے اس فعل سے باز نہیں آتا۔ یوں وہ کہیں گے ہم اسلام کے لئے قربان، ہم احمدیت کے لئے قربان مگر اس شخص کی قربانی کے دعویٰ پر کوئی احمق ہی یقین کر سکتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح احکام کی عَلَی الْاِعْلَان نافرمانی کرتا اور پھر قربانی اور محبت کا بھی دعویٰ کرتا چلا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تو وہ شخص بڑا احمق ہے جو اسلام کی عزت اور شریعت کی عزت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے قیام کے لئے ایسے شخصوں پر اعتبار کر لیتا ہے جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی چھوٹی سی بات نہیں مان سکتا۔ اس سے یہ کب توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر اس کے سامنے کوئی بڑی بات پیش کی جائے گی تو وہ اسے مان لے گا وہ تو فوراً اکڑ کر کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا کہ مَیں اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جیسے گزشتہ خطبہ میں ہی مَیں نے بیان کیا تھا کہ کسی شخص کا ایک حد تک فرمانبرداری کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ فرمانبردار ہے۔ ممکن ہے اس کی طبیعت کا رخ ہی اسی طرف ہو اور جب اس کی طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش ہو تو اس کا انکار کر دے۔ اس صورت میں وہ فرمانبردار نہیں بلکہ اپنی طبیعت کے مطابق کام کرنے والا سمجھا جائے گا۔ پس جو شخص بلا کسی ایسی وجہ کے جو شرعی طور پر اسے بری قرار دے ڈاڑھی منڈواتا ہے وہ صاف طور پر اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کو ماننے کے لئے مَیں تیار نہیں ہوں۔ یہ حکم میری مرضی کے خلاف ہے اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بزبانِ حال کہہ دیتا ہے کہ آپ کا فلاں حکم چونکہ میری مرضی کے خلاف ہے۔ اس لئے اس پر مَیں عمل نہیں کر سکتا۔ اس پر میرے جیسا انسان کیا اعتبار کر سکتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادموں کا ایک خادم ہے۔ جو شخص میرے آقا کی بات نہیں مانتا اور پھر یہ توقع رکھتا ہے کہ مَیں اسے احمدیت کا پہلوان، اسلام کا خادم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جاں نثار سپاہی سمجھوں۔ وہ میری عقل کی بڑی توہین کرتا ہے اور دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ یا تو وہ مجھے پاگل سمجھتا ہے یا ایسا مغرور اور متکبر خیال کرتا ہے کہ گویا میرا خیال ہے کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانتے وہ میری ضرور مان لیں گے اور ان دونوں صورتوں میں وہ میری ہتک کرتا ہے۔ پس یا تو وہ مجھے متکبر اور اپنے فہم کے مطابق نَعُوْذُ بِاللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل خیال

کرتا ہے اور یا مجھے بے وقوف خیال کرتا ہے کہ میں اس کی ظاہری باتوں سے دھوکا میں آجاؤں گا۔ بو علی سینا ایک مشہور طبیب گزرے ہیں۔ اخلاقی طور پر تو وہ اچھے آدمی نہیں تھے۔ کثرت سے شراب پیتے اور کئی مَنْہیات کے مرتکب ہوا کرتے تھے لیکن جیسے بعض لوگ عقیدے میں راسخ ہوتے ہیں انہیں بھی عقیدہ میں رسوخ حاصل تھا۔ فلسفی بڑے تھے اور بال کی کھال نکالنے کے عادی تھے۔ کسی موقع پر انہوں نے فلسفہ کے متعلق ایک اچھی سی تقریر کی۔ ایک شاگرد ان کی اس تقریر سے ایسا متاثر ہوا کہ کہنے لگا خدا کی قسم تم نبی ہو اور پھر اسی جوش کی حالت میں یہاں تک کہہ بیٹھا کہ اگر محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانہ میں تم ہوتے تو تم کو اس مقام پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کھڑا کیا جاتا جس مقام پر محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کھڑے ہوئے تھے۔ بو علی سینا حکیم تھے اور وہ طبائع کو اور طبائع کے سمجھانے کے اوقات کو سمجھتے تھے۔ اس وقت وہ خاموش ہو گئے اور مہینوں انہوں نے اپنے دل میں یہ بات رکھی۔ وہ سرد ملک کے رہنے والے تھے ایک دفعہ سردی کا موسم تھا صبح کا وقت تھا وہ تالاب کے کنارے کھڑے تھے اور پانی یخ بستہ تھا کہ انہوں نے اپنے اسی شاگرد کو بلایا اور کہا کہ اس تالاب میں چھلانگ لگاؤ۔ وہ شاگرد انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اور کہنے لگا جناب پاگل ہو گئے ہیں۔ اس قدر حکمت کا آپ کو دعویٰ ہے اور اس یقینی موت میں آپ مجھے دھکیل رہے ہیں اور اگر آپ پاگل ہی ہو چکے ہیں تو کم از کم میں تو پاگل نہیں کہ آپ کی بات مان لوں۔ بو علی سینا نے کہا تمہیں یاد ہے کچھ مہینے گزرے تم نے مجھے کہا تھا کہ اگر محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانہ میں مَیں ہوتا تو جس مقام پر محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کھڑے کئے گئے ہیں اس مقام پر مَیں کھڑا کیا جاتا۔ احمق! محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک نہیں ہزاروں کو یقینی موت کے مُنہ میں دھکیلا اور وہ بغیر چون و چرا کئے موت کے مُنہ میں چلے گئے اور انہوں نے اُف تک نہ کی مگر مَیں نے تو صرف تجھ کو جس نے مجھے وہ مقام دینا چاہا تھا جو محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو خدا نے دیا اس تالاب میں کُودنے کو کہا اور تُو مجھے پاگل سمجھنے لگا۔ کیا تُو اس فرق کو نہیں سمجھتا کہ بات کرنی اَور چیز ہے اور دنیا کے حالات میں تغیر پیدا کرنے کی قابلیت اور چیز ہے۔

مَیں نے کئی دفعہ سنایا ہے کہ یوں تو جہاد کے موقع پر ہمیشہ ہی مسلمانوں نے اپنے آپ کو آگ میں جھونکا مگر ایک موقع پر ایک صحابی نے بعینہٖ یہی فقرہ کہا تھا۔ چنانچہ بدر کے

موقع پر جب بار بار رسول کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم مشورہ دینے کو فرماتے تو ایک صحابی کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ! کیا آپ ہم انصار سے مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس مقام سے سمندر کچھ منزل پر تھا۔ اس نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ہمیں آپ کی صداقت پر ایسا یقین ہے کہ اگر آپ کہیں کہ یہ جو سامنے سمندر ہے اس میں تم سب کُود جاؤ تو ہم بغیر کسی عذر کے اس میں کودنے کے لئے تیار ہیں حالانکہ سمندر میں سے کوئی شخص تیر کر نہیں گزر سکتا۔ وہ سینکڑوں میل کا سمندر تھا اور چار پانچ سو میل چوڑا تھا۔ اس میں سے ان کو کوئی چیز بچا نہیں سکتی تھی مگر انہوں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ! آپ اگر کہیں کہ ہم سمندر میں کُود جائیں تو ہم اس میں بھی کُود جائیں گے اور اس کے مقابلہ میں کسی قسم کا عذر نہیں کریں گے۔[3] تو رسول کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو عملی طور پر ایسے لوگ ملے تھے جنہوں نے اپنے آپ کو موت کے مُنہ میں ڈال دیا اور یہ آپ کا ہی کمال تھا ورنہ یہ وہی عرب تھے جو دو دو پیسوں کے لئے لڑا کرتے تھے جو خربوزوں اور تربوزوں کے لئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہو جاتے تھے مگر پھر یہی عرب تھے جنہوں نے محمد صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی آواز پر ایسی قربانی کی کہ جس کی مثال دنیا کے پردہ پر نہیں مل سکتی۔

قربانی کی مثالیں اور جگہ بھی مل جائیں گی مگر اتنی کثرت سے ساری قوم کا چند منافقوں کو چھوڑ کر قربانی کے لئے تیار ہو جانا ایسا اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہے کہ انسان کی عمر اس پر حیرت اور استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کا مِل جانا فتح کو بالکل یقینی بنا دیتا ہے مگر یہ تغیر محمد صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی صحبت میں ہی رہ کر صحابہ میں پیدا ہوا تھا اور صحابہ کو بھی رسول کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ایسی محبت تھی کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان کا نقطۂ مرکزی صرف محمد صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات تھی چنانچہ جب کسی شخص نے حضرت عائشہ سے سوال کیا کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کچھ صفات تو بیان کیجئے تو آپ نے جواب دیا کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ[4] آپ کے اخلاق وہی ہیں جو قرآن میں لکھا ہے اور جو کچھ قرآن میں لکھا ہے وہ آپ کے اخلاق ہیں پھر کس قسم کی محبت تھی ان لوگوں کے دلوں میں؟ مجھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہمیشہ ہی یاد رہتا ہے کہ مدینہ میں کم سے کم اس وقت تک جبکہ یہ واقعہ ہوا اچھی چکیوں کا رواج نہیں تھا۔ لوگ

پتھروں پر دانے کچل لیتے اور پتھروں پر ہی پیس کر پھونکوں سے اس کے چھلکے اڑا کر روٹی پکا لیا کرتے تھے۔ جب ایران فتح ہوا تو پَن چکیاں اور ہوا کی چکیاں آئیں اور ان سے میدے جیسا باریک آٹا پسنے لگا۔ صحابہؓ نے کہا سب سے پہلا آٹا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھیجنا چاہئے چونکہ یہ چکی کا پہلا اعلیٰ درجے کا باریک آٹا تھا اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں صحابہ کی طرف سے نذر کے طور پر بھیجا گیا۔ اس وقت کئی عورتیں آپ کے ارد گرد بیٹھی تھیں، روٹی پکانے والی نے روٹی پکائی اور ساری عورتیں اسے دیکھ دیکھ کر حیرت کا اظہار کرنے لگیں کہ کیا ہی نرم روٹی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی اس کا ایک لقمہ توڑ کر مُنہ میں ڈالا مگر لقمہ مُنہ میں ڈالنا ہی تھا کہ ٹپ ٹپ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ عورتیں جو پاس بیٹھی تھیں پھر چھلکے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ اُمّ المومنین روٹی تو بڑی نرم ہے ایسی روٹی تو ہم نے کبھی دیکھی نہین تھی۔ آپ اسے کھا کر روتی کیوں ہیں؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا یہ لقمہ میرے گلے میں پھنستا ہے۔ پھر انہوں نے کہا تم کو کیا معلوم کہ ان پن چکیوں اور ہوا کی چکیوں سے پہلے ہم کیا کیا کرتی تھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چکیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ہم غلہ کو پتھر سے کُوٹ کر اور اس کا آٹا بنا کر روٹی پکایا کرتے تھے۔ جب یہ لقمہ میرے منہ میں گیا تو مجھے معاً وہ زمانہ یاد آکر رونا آگیا۔ اگر اس وقت بھی ایسی ہی چکیاں ہوتیں۔ تو مَیں اس آٹے کی روٹی پکا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلاتی۔ تو دیکھو جو آٹا مدینہ کے دوسرے لوگوں کے لئے حیرت پیدا کرنے کا موجب تھا جو آٹا لوگوں کو ملائم ملائم دکھائی دیتا تھا۔ جو آٹا لوگوں کو روٹی کھانے کا اشتیاق دلا رہا تھا۔ اسی آٹے کا لقمہ عائشہؓ کے گلے میں پھنسنے لگ گیا۔

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق ہی تھے جنہوں نے ایسا عظیم الشان تغیر پیدا کیا ورنہ اگر دنیوی نگاہ سے دیکھو تو حضرت عائشہؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کر کے کیا فائدہ پہنچا۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں ایک لڑکی بیاہی گئی جو بیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی اور پھر اس کی ساری عمر ہی بیوگی میں کٹ گئی۔ دنیا داروں کی بیویاں ایسے موقع پر شاید روز اپنے خاوندوں کو بد دعائیں دیتی ہوں گی مگر وہ تعلق دنیا کا نہیں تھا بلکہ دین کا تھا عائشہؓ یہ نہیں سمجھتی تھیں کہ میری شادی ایک انسان سے ہوئی ہے بلکہ عائشہؓ یہ سمجھتیں کہ میری شادی ایک ایسے

انسان سے ہوئی ہے جو دوسرے کے ہاتھ کو پکڑ کر اس کا ہاتھ خدا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اسی طرح اَور بھی بیسیوں واقعات صحابہؓ کی زندگیوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن سے اس محبت کا پتہ چلتا ہے جو انہیں رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات سے تھی اور درحقیقت یہی وہ نمونہ تھا جس نے لوگوں کے اندر ایک تغیر پیدا کر دیا۔ پس بو علی سینا کا یہ مثال دینا واقع میں ایک بہت بڑی علمی دلیل تھی۔

تو رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک ایسا تغیر دنیا میں پیدا کر دیا ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ ایسے انسان کی فرمانبرداری اور اطاعت سے اگر کوئی شخص مُنہ موڑ لیتا ہے تو پھر میرا اس پر کس طرح یقین ہو سکتا ہے بلکہ جس شخص کے دماغ میں ایک ذرّہ بھر بھی عقل ہو وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ اس نے رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بات تو نہیں مانی مگر میری مان لے گا۔ مَیں نے بتایا ہے کہ یا تو وہ پاگل ہو گا یا انتہاء درجے کا متکبر اور مغرور ہو گا جو اس دھوکا میں آجائے گا۔

مَیں نے متواتر جماعتوں کو توجہ دلائی ہے اور ہمارے ہاں قانون بھی ہے کہ کم سے کم جماعت کے عہدیدار ایسے نہیں ہونے چاہئیں جو ڈاڑھی منڈواتے ہوں اور اس طرح اسلامی احکام کی ہتک کرتے ہوں مگر مَیں دیکھتا ہوں اب بھی دنیاداری کے لحاظ سے جس کی ذرا تنخواہ زیادہ ہوئی یا چلتا پرزہ ہوا یا دنیوی لحاظ سے اسے کوئی اَور اعزاز حاصل ہوا اسے جماعت کا عہدیدار بنا دیا جاتا ہے۔ خواہ وہ ڈاڑھی منڈواتا ہی ہو حالانکہ دنیوی لحاظ سے ہماری جماعت کے بڑے سے بڑے آدمی بھی ان لوگوں کے پاسنگ بھی نہیں۔ جو اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں اور اگر دنیوی لحاظ سے ایسے لوگوں کو عہدیدار بنایا جا سکتا ہے تو عیسائیوں اور ہندوؤں کو کیوں نہیں بنایا جا سکتا وہ بہت زیادہ دولت مند اور دنیوی لحاظ سے بہت زیادہ معزز ہوتے ہیں مگر درحقیقت یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے اسلام اور احمدیت کے جیتنے کی امید نہیں اور جو اسلام اور احمدیت کو ایک شکست خوردہ مذہب سمجھتا ہے ورنہ جو شخص اسلام اور احمدیت کو جیتنے والا مذہب سمجھتا ہے اس کے سامنے تو اگر کروڑپتی بھی آجائیں تو وہ ان کو حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور دنیا کے تمام بادشاہوں کو بھی ایک سچے مومن کے مقابلہ میں ذلیل سمجھتا ہے۔

دنیا آخر ہے کیا چیز؟ کب یہ خدا کے نبیوں کے مقابلہ میں کھڑی ہوئی اور کامیاب

ہوئی۔ آخر ہزاروں نبی دنیا میں آئے ہیں۔ ان ہزاروں نبیوں میں سے کب کوئی ایسا نبی آیا کہ اسے دنیوی لحاظ سے کوئی عزت حاصل تھی لیکن کب اس کا سلسلہ ختم ہوااور وہ فاتح اور حکمران نہیں تھا۔ یہی حال احمدیت کا ہے۔ پس ایسی شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ جنہوں نے مغربیت کے آگے اپنے ہتھیار ڈال رکھے ہیں وہ ہرگز کسی عہدہ کے قابل نہیں ہیں۔ وہ بھگوڑے ہیں اور بھگوڑوں کو حکومت دے دینا اول درجہ کی حماقت اور نادانی ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دیکھو۔ یہ وہ بہادر لوگ تھے جو سمجھتے تھے کہ اسلام کی باگ کن لوگوں کے ہاتھ میں دی جانی چاہئے۔

عکرمہ بن ابو جہل اسلام کے ایک بہت بڑے بہادر جرنیل گزرے ہیں۔ ایک جنگ کے موقع پر اتفاقیہ طور پر ان کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور اس لشکر کے ساتھ وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ دنیا میں اگر کسی گندی اور سڑاند والی چیز سے اعلیٰ درجے کا ہیرا پیدا ہوا ہے تو وہ عکرمہؓ ہے۔ ابو جہل جیسے خبیث اور ناپاک آدمی کے نطفہ سے عکرمہؓ ایسا اعلیٰ درجہ کا مومن پیدا ہوا ہے جس کی مثال دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ مگر وقت ہوتا ہے۔ کسی وقت انسان کا قدم اکھڑ جاتا ہے۔ اس وقت لشکر جو بھاگا تو حضرت عکرمہؓ بھی بھاگ کھڑے ہوئے اس میں کچھ غلطی ان کی بھی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ نے حکم دیا تھا کہ جب تک فلاں لشکر نہ پہنچ جائے حملہ نہ کرنا مگر انہوں نے اس لشکر کے آنے سے پہلے ہی جہاد کے شوق میں حملہ کر دیا اور جب لشکر پسپا ہوا تو وہ بھی میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ اسلام کے لئے ایک بہت بڑی ہتک کا موقع تھا کیونکہ اسلام نے کبھی ایسی شکست نہیں کھائی تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جب یہ معاملہ پہنچا تو آپ نے فیصلہ کیا کہ عکرمہ کو آئندہ کسی لشکر کی کمان سپرد نہ کی جائے اور نہ آئندہ وہ میرے سامنے کبھی مدینہ میں آئیں۔ گویا وہ مقدس مقام جس کے ایک ایک انچ پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں پڑے تھے اور جس کو دیکھنے کے لئے مسلمان تڑپتے رہتے تھے اس کے متعلق عکرمہؓ کو حکم دے دیا گیا کہ وہ اس مقام میں آئندہ نہ آئیں چنانچہ عکرمہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں پھر مدینہ میں نہیں آئے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ بعد میں انہیں آنے کی اجازت دی گئی تھی یا نہیں۔ عکرمہؓ نے جس جس رنگ میں اپنی اس غلطی کا کفارہ کیا ہے اور سالہا سال

اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا یہانتک کہ آخر شہادت کی موت قبول کر لی وہ ایمان کا ایسا اعلیٰ درجے کا مظاہرہ ہے کہ ہر سچا مومن اس کی نقل کرنے کی آرزو اپنے دل میں رکھتا ہے مگر بہرحال ان کی اس وقت شکست کو جو بعد میں بدل گئی اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اتنا محسوس کیا کہ انہوں نے فیصلہ فرما دیا کہ ایسی بھگوڑی ذہنیت رکھنے والے شخص کو اسلامی لشکر کی کمان سنبھالنے کے قابل نہیں سمجھا جا سکتا۔

پس غور کرو کہ تائب عکرمہؓ کو بھی ابو بکرؓ اسلامی لشکر کی کمان نہیں دیتے، بھاگنے والے عکرمہؓ کو نہیں۔ وہ عکرمہ جو میدان سے بھاگا اس کے متعلق یہ فیصلہ نہیں بلکہ یہ فیصلہ اس کے متعلق ہے جو واپس لَوٹا اور جس نے مختلف میدانوں میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر دشمن پر فتح حاصل کی مگر توبہ کرنے والے عکرمہؓ کے متعلق بھی حضرت ابو بکرؓ کا فیصلہ یہی تھا کہ ایسی بھگوڑی ذہنیت کے انسان کے ہاتھ میں اسلامی لشکر کی کمان نہیں دی جا سکتی۔ پھر کیسے افسوس کی بات ہے ان احمدیوں کے لئے جو محض اس وجہ سے کہ فلاں شخص کی تنخواہ زیادہ ہے، فلاں دو سو روپے لیتا ہے اور فلاں پانچ سو اور فلاں ہزار۔ ان دنیا دار لوگوں کو اپنی جماعت اور پریذیڈنٹ اور سیکرٹری بنا دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اپنے عمل سے اسلام اور احمدیت کی ہتک کرنے والے ہیں۔ جس فوج کے بھگوڑے کمانڈر ہوں اس فوج کی شکست میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اور جو لوگ اتنا بھی خدا اور رسول کے وعدوں پر یقین نہیں رکھتے اور خیال کرتے ہیں کہ اگر فلاں شخص گو وہ کیسا ہی دنیادار ہے عہدیدار نہ ہوا تو جماعت کی عزت نہیں رہے گی وہ اپنے عمل سے اسلام اور احمدیت کی شکست کا اظہار کرتے ہیں۔ پس ایسے لوگ بھی مجرم ہیں جو ان لوگوں کو عہدیدار بناتے ہیں اور وہ لوگ بھی مجرم ہیں جو ایسی باتوں میں یورپین لوگوں کی نقل کرتے ہیں۔ وہ محمد ﷺ کی طرف پیٹھ کر کے دجال کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہیں۔ گویا دجال ان کے نزدیک بڑی عزت والی چیز ہے جس کی نقل کرنے میں ان کی نجات ہے۔ لیکن محمد ﷺ ان کے نزدیک نَعُوْذُ بِاللّٰہ ایک بے عزت وجود ہے کہ ان کی طرف انہوں نے پیٹھ کر لی ہے۔ پس مَیں ایک دفعہ پھر جماعتوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ یہاں سوال چند بالوں کا نہیں بلکہ یہاں سوال اس ذہنیت کا ہے جو مغربیت کے مقابلہ میں اسلام اور

احمدیت نے پیدا کرنی ہے اور جس ذہنیت کو ترک کر کے انسان مغربیت کا غلام بن جاتا ہے۔ آخر کونسی بات ہے جس کے لئے لوگ انگریزوں کی نقل کرتے ہیں۔ بس اتنی سی بات کے لئے کہ وہ کہہ سکیں ہم فلاں انگریز سے ملنے کے لئے گئے تھے تو اس نے مسکرا کر ہم سے بات کی۔ اتنی سی بات پر وہ لٹو ہو جاتے ہیں اور بندر کی طرح ان کی نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

تُف ہے ایسے ایمان پر اور تُف ہے ایسی عزت پر۔ تمہارا ایمان تو ایسا ہونا چاہئے کہ اگر دس کروڑ بادشاہ بھی تمہیں آکر کہیں کہ ہم تمہارے لئے اپنی بادشاہتیں چھوڑنے کے لئے تیار ہیں تم ہماری صرف ایک بات مان لو جو اسلام کے خلاف ہے تو تم ان دس کروڑ بادشاہوں سے کہہ دو کہ تُف ہے تمہاری اس حرکت پر۔ مَیں تو محمد مصطفیٰ ﷺ کی ایک بات کے مقابلہ میں تمہاری اور تمہارے باپ دادا کی بادشاہتوں کو جوتی بھی نہیں مارتا۔ یہ ہے ایمان کی کیفیت۔ جو شخص یہ کیفیت اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا اس کا یہ دعویٰ کہ اس کا ایمان پکا ہے ہم ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ایسے لوگ مومن نہیں، گنہگار بھی مومن ہوتے ہیں۔ مگر ایسی بھگوڑی ذہنیت رکھنے والے کمان اور سرداری کے مستحق نہیں سمجھے جا سکتے۔ سرداری اور کمان ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہی ہونی چاہئے جو بہادر ہوں، دلیر ہوں اور سمجھتے ہوں کہ احمدیت کی خاطر اور اس کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے ہم ہر ممکن قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مَیں نے ایسی مثالیں اپنی جماعت میں بھی دیکھی ہیں۔ مَیں ایک دفعہ ایک جماعت میں گیا۔ اس جماعت کے امیر ایک ایسے دوست تھے جو صرف ستّر اَسّی روپے ماہوار تنخواہ لیا کرتے تھے مگر ان کے ماتحت اس وقت ایک احمدی افسر مال تھے، ایک احمدی سب جج تھے، ایک فوج کے کپتان تھے اور ایک جیل خانہ کے افسر تھے۔ یہ چار بڑے بڑے عہدیدار ان کے ماتحت تھے جن میں سے دو امپیریل سروس کے سمجھے جاتے تھے اور گورنمنٹ کی اعلیٰ درجہ کی نوکریاں امپیریل سروس والوں کو ہی ملا کرتی ہیں۔ مَیں نے ان امیر صاحب کو ایک ضرورت کے ماتحت لکھا تھا کہ سٹیشن پر کوئی شخص استقبال کے لئے نہ آئے سوائے اس کے کہ وہ اپنے امیر سے اس کی اجازت لے چکا ہو۔ جب میں سٹیشن پر پہنچا تو ایک نوجوان انہی افسروں میں سے سٹیشن پر موجود تھا۔ مَیں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ اپنے امیر صاحب کی طرف اشارہ

کر کے کہنے لگے کہ مَیں ان سے اجازت لے کر آیا ہوں اور امیر صاحب نے بھی کہا کہ مَیں نے انہیں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ پھر وہاں مَیں نے دو دن قیام کیا اور مَیں نے دیکھا کہ وہ نوجوان جو صرف ساٹھ ستّر یا اسّی روپے ماہوار تنخواہ لیتا تھا احمدیت کا اخلاص رکھنے اور اس کی تعلیم کو سمجھنے کی وجہ سے ذرا بھی ان افسروں سے مرعوب نہیں تھا اور ایسی عمدگی سے ان پر حکومت کر رہا تھا کہ مجھے دیکھ کر بہت ہی خوشی ہوئی کہ یہ سچا احمدی نمونہ ہے اور وہ دوسرے افسر بھی اس کی اطاعت کر رہے تھے اور اپنی ذات میں ان کی اطاعت بھی ایک نمونہ تھی مگر ایک معمولی تنخواہ پانے والے کا اپنی تنخواہ سے دس دس پندرہ پندرہ گنا زیادہ تنخواہ لینے والوں اور اپنے افسروں سے بھی بڑے افسروں پر حکومت چلا لینا ان کی قربانی سے زیادہ بہتر نمونہ تھا جس کے ساتھ حکمت عملی بھی شامل تھی۔ تو مومن جب کوئی کام کرتا ہے وہ اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ بڑا کون ہے اور چھوٹا کون ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ بڑا وہی ہے جو سب سے بڑے کی اطاعت کرے اور انسانوں میں سے سب سے بڑے محمد صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہیں۔ پس جو شخص ان کی اطاعت نہیں کرتا وہ بڑا کس طرح ہو سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہی واقعہ ہے۔ کوفہ کے لوگ بڑے باغی تھے اور وہ ہمیشہ اپنے افسروں کے خلاف شکایتیں کرتے رہتے تھے کہ فلاں قاضی ایسا ہے فلاں میں یہ نقص ہے اور فلاں میں وہ نقص ہے۔ حضرت عمرؓ ان کی شکایت پر حکام کو بدل دیتے اور اَور افسر مقرر کر کے بھیج دیتے بعض لوگوں نے کہا بھی کہ یہ طریق درست نہیں۔ آپ بار بار افسروں کو نہ بدلیں مگر حضرت عمرؓ نے کہا مَیں افسروں کو بدلتا ہی چلا جاؤں گا۔ یہاں تک کہ کوفہ والے خود ہی تھک جائیں۔ جب اسی طرح ایک عرصہ تک ان کی طرف سے شکایتیں آتی رہیں تو حضرت عمرؓ نے کہا اب مَیں کوفہ والوں کو ایک ایسا گورنر بھجواؤں گا جو انہیں سیدھا کر دے گا۔ یہ گورنر انیس سال کا ایک نوجوان تھا۔ عبد الرحمان اس کا نام تھا۔ جب کوفے والوں کو پتہ لگا کہ انیس سال کا ایک لڑکا ان کا گورنر مقرر ہو کر آیا ہے تو انہوں نے کہا آؤ ہم سب مل کر اس سے مذاق کریں۔ وہ شریر اور شوخ تو تھے ہی۔ انہوں نے بڑے بڑے جُبّہ پوش لوگوں کو جو ستّر ستّر، اَسّی اسّی، نوّے نوّے سال کے تھے اکٹھا کیا اور فیصلہ کیا کہ ان سب بوڑھوں کے ساتھ شہر کے

تمام لوگ مل کر عبد الرحمان کا استقبال کرنے کے لئے جائیں اور مذاق کے طور پر اس سے سوال کریں کہ جناب کی عمر کیا ہے۔ جب وہ جواب دے گا تو خوب ہنسی اڑائیں گے چنانچہ اس سکیم کے مطابق وہ شہر سے دو تین میل باہر اس کا استقبال کرنے کے لئے آئے۔ اُدھر سے گدھے پر سوار عبد الرحمان ابن ابی لیلیٰ بھی آنکلے۔ کوفہ کے تمام لوگ صفیں باندھ کر کھڑے تھے اور سب سے اگلی قطار بوڑھے سرداروں کی تھی۔ جب عبد الرحمان ابن ابی لیلیٰ قریب پہنچے تو انہوں نے پوچھا۔ کیا آپ ہی ہمارے گورنر مقرر ہو کر آئے ہیں اور عبد الرحمان آپ کا ہی نام ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ اس پر ان میں سے ایک بہت بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور اس نے کہا جناب کی عمر! عبد الرحمان نے کہا میری عمر! تم میری عمر کا اندازہ اس سے لگا لو کہ جب رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اسامہ بن زیدؓ کو دس ہزار صحابہؓ کا سردار بنا کر بھیجا تھا جس میں ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی شامل تھے تو جو عمر اُس وقت اسامہ بن زیدؓ کی تھی اُس سے ایک سال میری عمر زیادہ ہے۔ یہ سنتے ہی جیسے اوس پڑ جاتی ہے وہ پیچھے ہٹ گئے اور انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ جب تک یہ لڑکا یہاں رہے خبر دار! تم نے بولنا نہیں ورنہ یہ کھال ادھیڑ دے گا چنانچہ انہوں نے بڑے عرصہ تک گورنری کی اور کوفہ والے ان کے سامنے بول نہیں سکتے تھے۔ یہ اتنا زبردست لائق نوجوان تھا کہ بچپن میں انگریزی کی جو ریڈریں ہمیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں بھی ان کے قصے درج ہوتے تھے نام تو نہیں لکھا ہوتا تھا صرف سگیشس قاضی (Sagacious Qazi) یعنی عقلمند قاضی لکھ کر ان کے کئی فیصلے قصوں کہانیوں کے رنگ میں لکھے ہوتے تھے۔ انگریزوں نے نظموں کی شکل میں بھی ان کے کئی فیصلے نقل کئے ہیں۔ تو جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے اسے کسی دنیوی عہدے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ بڑی عمر کی اسے ضرورت ہوتی ہے، نہ دولت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ظاہری علم کی بھی اسے ضرورت نہیں ہوتی۔ محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم آخر کون سے کالج میں پڑھے ہوئے تھے؟ یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کس کالج میں تعلیم حاصل کی تھی؟ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ علم دیا کہ دنیا ہزاروں سال تک ان کی خوشہ چینی کرتی چلی جائے گی اَور پھر بھی ان کا خزانہ ختم نہیں ہو گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو جو کتاب دی وہ ہے تو خدا کا کلام مگر اس میں کیا شبہ ہے

کہ خدا کا کلام ظرف کے مطابق اترتا ہے پس بے شک وہ خدا کا کلام ہے مگر جہاں وہ خدا کا کلام اور اس کا الہام ہے وہاں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ محمد ﷺ کا ظرف کتنا بڑا ہے۔ میری تو یہ حالت ہے کہ اس کتاب کو دیکھ کر بعض دفعہ میری مجنونانہ حالت ہو جاتی ہے اور جب مَیں اس کے علوم کو دیکھتا ہوں تو حیران ہو جاتا ہوں۔ ہے تو وہ پاگلوں کی سی بات مگر چونکہ خدا کے کلام کی شان اس سے ظاہر ہوتی ہے اس لئے مَیں اسے بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے۔ مَیں ایک دن قرآن کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے مطالب در مطالب مجھ پر کھلنے لگے اور ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نکتہ مجھ پر کھلنے لگ گیا اور ایسا علوم کا تانتا بندھا کہ میری عقل حیران ہو گئی اور مَیں نے یہ کہتے ہوئے قرآن کو اپنے سامنے فرش پر رکھ دیا کہ واہ اللہ میاں! تیری کتاب بھی عجیب ہے۔ تو یہ ایک ایسا علم خدا نے ہمیں دیا ہے کہ اگر ہزاروں سال تک دنیا کے عالم اس کی خوشہ چینی کرتے رہیں تب بھی یہ علم ختم نہیں ہو سکتا۔ پس اگر خدا سے سچا تعلق ہو تو ظاہری علم کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایسے شخص کو علم لدنی عطا کیا جاتا ہے اور وہ کسی موقع پر بھی شرمندہ نہیں ہوتا خواہ دنیا کے کتنے بڑے بڑے عالموں سے اس کا مقابلہ کیوں نہ ہو۔

پس اپنی جماعت کے عہدیدار منتخب کرتے وقت ہمیشہ اس امر کو مدنظر رکھو کہ ان میں دین ہو تقویٰ ہو، پاکیزگی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی سچی محبت ہو اور ہر قسم کی قربانی کے لئے وہ تیار رہنے والے ہوں۔ اگر ان میں دین اور تقویٰ نہیں اور محض اس لئے عہدہ دے دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص بڑا چلتا پرزہ ہے یا حکام کے نزدیک عزت رکھتا ہے یا بڑی تنخواہ لیتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایسے لوگوں کو اپنا عہدیدار بنانے والے اسلام اور احمدیت کی طاقت کے منکر ہیں۔ ایسے لوگ یادرکھیں کہ ان کی نہ انجمنیں کامیاب ہو سکتی ہیں نہ عہدیدار کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ شکست خوردہ ذہنیت کے بھگوڑے ہیں اور جب بھی اسلام کی طرف سے جنگ ہو گی یہ لوگ پیچھے رہ جائیں گے اور شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے وہی لوگ آگے آئیں گے جو گو بظاہر کمزور اور ناطاقت ہیں۔ مگر ان کے ایمان کی طاقت ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔"

(الفضل 30 جون 1942ء)

1: راشے: پر، بال وپر
2: مسلم کِتَابُ الْاِیْمَان باب تحریم ضرب الْخُدُوْد (الخ)
3: السّیرۃ الحلبیۃ جلد2 صفحہ160 مطبوعہ مصر1935ء
4: مسند احمد بن حنبل جلد6 صفحہ 91۔ مطبوعہ مصر1313ھ